Article

The Presentation of civilization and culture in Ashfaq Ahmed's fiction.

اشفاق احمد کے افسانوں میں تہذیب و ثقافت کی پیش کش

Maryam Akram Khan*1
Ph.D Scholoar, Department of Urdu, Govt College University, Faisalabad.
Dr. Rabia Sarfraz*2
Chairperson, Department of Urdu, Govt College University, Faisalabad.

*1 مریم اکرم خان
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
*2 ڈاکٹر رابعہ سرفراز
صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Correspondanance: dr.rabiasarfraz@yahoo.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 16-10-2024
Accepted: 20-11-2024
Online: 25-12-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Literature is the mirror of life that reflects society, its culture,emotions, sensation, experiences and thoughts. The present research presents the socio- Cultural aspects of modern Urdu Fiction with special reference to the short stories of Ishfaq Ahmad. Ishfaq Ahmad stands out among all Contemporary Short story writers. His short stories depicts history, socio-cultural norms,values, contemporary life and its problems. The present study is qualitative in nature and the researcher has employed textual analysis to study the socio-cultural aspects of Ishfaq Ahmad's short stories. Nonetheless, the results show that Ishfaq Ahmad has beautifully examined the socio-cultural aspectes of civilization.

KEYWORDS: Literature, Religion, Science, Fiction, Social Culture, Diversity, Technology

:

تہذیب و ثقافت ایک ایسا ہمہ جہت 'ہمہ گیر' رنگارنگ اور متنوع لفظ ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ انسانی سماج نے تہذیبوں ثقافت کے سائے میں ارتقاء کی منازل طے کی ہیں۔ تہذیب اپنے اندر وہ تمام چیزیں سموئے ہوئے ہے جو ایک ممتدن معاشرے کے لیے صروری ہیں۔ تہذیب ایک تمنا اور آرزو ہے جو معاشرے میں رہنے والے افراد کو انسان دوستی، مساوات، جذبہ خیر سگالی، رواداری اور محبت جیسی اعلیٰ و ارفع اقدار اور اصولوں کے پیش نظر انفرادی نفادات پر اجتمائی و سماجی ارتقاء اور فلاح و بہبود کو ترجیح دیتا ہے۔ تہذیب و ثقافت ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق اعیان یا اقدار سے ہے۔ مادی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو مادی مظاہر سے منسلک ہیں۔ اس میں رہن سہن، لباس، سماجی رسوم و رواج، مصوری، فن تعمیر اور نقاشی تمام چیزیں شامل ہیں اور روحانی نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو اس بنیاد فکر و فلسفہ، علوم و فنون، علم و ادب، خیالات و احساسات، مذہبی اقدار ور تصورات پر ہے۔ جو پورے سماج اور معاشرے کو تہذیبی وحدت میں ڈھالتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت خلا میں پرورش نہیں پاتیں بلکہ ہر سماج اور معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت خود بناتا ہے۔ یہ ایک ایسا ورثہ ہے جو ایک نسل اپنی دوسری نسل کو منتقل کرتا ہے۔ درحقیقت تہذیب و ثقافت اُن تمام خصوصیات کا احاطہ کرتی ہیں جو کسی مخصوص گروہ، معاشرے اور قوم میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ خصوصیات اُس گروہ کو باقی افراد قوم اور معاشروں سے مختلف بناتے ہیں۔ فیض احمد فیض تہذیب و ثقافت یا کلچر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ”ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے، اس کے آداب اور اس کے اخلاقِ ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔“ (1)

گویا تہذیب و ثقافت ہی وہ بندھن ہے جو ان مشترکہ خصوصیات کی بنیاد پر افراد و اقوام کو باہم جوڑے ہوئے ہے۔ تہذیب و ثقافت زیادہ تر اکٹھے اور ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی استعمال ہیں لیکن ان میں واضح فرق بھی ہے۔ ثقافت کسی بھی گروہ یا معاشرے کی ان اقدار کی نمائندگی کرتی ہے جو عموماً تغیر و تبدل سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ داخلی خصوصیات مثلاً رسم و رواج اور مذہب پر مشتمل ہوتی ہیں جب کہ تہذیب ان اقدار و افکار پر عمل کرنے کے ذرائع ہیں۔ جو تغیر و تبدل سے بھرپور ہیں اور خارجی خصوصیات کی حامل ہوتے ہیں۔ ماہرین سماجیات تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو پہلو سمجھتے ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے تہذیب و ثقافت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات ورجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔" (۲)

تہذیب وثقافت وہ پیچیدہ کل ہیں جو عقائد علوم وفنون اخلاق قوانین اور علم کے ساتھ ساتھ ان صلاحیتوں اورعادات کو بھی اپنے اندر شامل کرتے ہیں جو فرد ایک معاشرے کے اہم جزو کے طور پر اختیار کرتا ہے۔

لفظ تہذیب کا مادہ اور ماخذ عربی ہے جس کے معنی ہیں 'اراستگی' اصلاح کرنا، پاک کرنا، شائستگی، معاشرے کے ایسے اصول وضوابط اور رسم ورواج جو کسی بھی معاشرے کے افراد کو نظم وضبط کے تحت زندگی گزارنے کے قابل بنائے۔ ڈاکٹر جمیل حالی نے لفظ تہذیب کو انگریزی لفظ Civilization کا ہم معنی قرار دیا ہے۔ یہ تمدن اور تہذیب کی وہ کیفیت ہے جس سے معاشرے کی ذہنی تمدنی اور معاشرتی ترقی ہوتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے تہذیب کو یوں بیان کیا ہے:

"Civilization: The achievement of a culture that is complex enough to sustain a heterogeneity of people and ideas able both to preserve its past and sponser innovation and possess the reaoures to ensure the transmission of its style and value as well as the unity of the people who comprise it."(3)

ایک اور جگہ اسٹرٹیڈ انسائیکلوپیڈیا وحشی پن اور حیوانیت سے مہذب ہونے کے عمل کو تہذیب قرار دیتے ہیں:

"To turn from barbarism; to teach Culture and lefinement: act of Civilization are state of being Civilized."(4)

گویا تہذیب وثقافت کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح کرنا اور سماجی ارتقاء ہے تاکہ معاشرے میں رہنے والے افراد اپنی صلاحیتوں اور ذہنی اکتسابات کو استعمال کرتے ہوئے ایسے کارنامے سرانجام دیں جو حیات انسانی کی ترقی و ارتقاء میں اہم کردار ادا کرے۔ اس کائنات میں انسان وہ واحد مخلوق ہے جس نے اپنے عقل و شعور، تجربات اور وجدان کی بدولت اپنے مستقبل کو بنایا اور سنوارا۔ اس حوالے سے سید مجاور حسین یوں رقم طراز ہیں:

> ''کلچر کے آغاز کے سلسلے میں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جس لمحہ سے اولین انسانی کوششوں کا سراغ ملتا ہے، اسی لمحہ سے کلچر کا آغاز ہوتا ہے جس طرح سورج کی پہلی کرن دن کی آمد کی پیامبر بن جاتی ہے اسی طرح انسان کی پہلی ذہنی، تخلیقی کوشش کلچر کا نقطہ آغاز ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی ترقی یافتہ شکل تین لاکھ سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر گورڈن چائلڈ کہتے ہیں کہ یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ عالم تاریخ کے کسی ایک لمحہ میں آسمان میں بگل بجا اور چین سے لے کر پیرو تک ہر شکاری نے اپنے آلات پھینک دیے اور ایک دم سے گیہوں، چاول اور باجرہ بونے لگا۔''(۵)

تہذیب و ثقافت کے بننے سنورنے اور جنم لینے کے لیے سماج کی ضرورت ناگزیر ہے۔ تہذیب و ثقافت کی طرح بھی سماج اور معاشرہ بھی پیچیدہ کل ہے۔ باطن کی سماجی تہیں ایک وحدت میں ڈھل کر سماج کی تشکیل کرتی ہیں مثلاً سماج میں مختلف ہیئتوں سے وابستہ افراد، ادنیٰ و اعلیٰ علوم وفنون کے ماہرین اور امیر وغریب سب مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر یہ سب اپنے الگ تہذیبی و ثقافتی ادارے رکھتے ہیں مگر تہذیبی وحدت و ارتقاء کے لیے یہ سب ایک تہذیبی وثقافتی اکائی بن جاتے ہیں اور یوں اجتماعی فائدے کے لیے انفرادی مفادات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ یوں رفتہ رفتہ تہذیب و ثقافت نشوونما کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ایک چھتنار درخت بن جاتا ہے جس کے زیرسایہ مختلف مذہبی وسماجی ادارے اور تہذیبی روایات و اقدار جنم لیتی ہیں۔

اشفاق احمد نے مختلف اصناف سُخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں افسانہ نگاری ایک اہم اور منفرد صنف ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں دورِ جدید کے بدلتے ہوئے رجحانات تہذیبی اقدار اور عصرِ حاضر کے مسائل کو نہایت عمدگی سے بیان کیا۔ ان کے موضوعات کسی خاص ملک یا خطے کی آبیاری نہیں کرتے بلکہ دورِ حاضر سواتے ہیں دور ر حاضر کی اقدار و مسائل کو موضوع بحث لاتے ہیں۔ نئی تہذیب کی تشکیل اور تخلیق سے مراد صرف یہ نہیں کہ زندگی کے نئے حقائق کو تلاش کیا جائے یا دانشور نئے اچھوتے خیالات کو نئے سانچوں میں ڈھالیں، بلکہ پہلے سے دریافت شدہ حقائق کی تنقید واشاعت کرنا اور انہیں نئے معاشرتی و سماجی ڈھانچوں میں ڈھالنا بھی تخلیقی باریاضت کا حصہ ہے۔ یہ تخلیقی عمل افرادِ معاشرہ کو مسوط و مربوط ڈھنگ سے سوچنے کے قابل بناتا ہے اور عمل و ایثار کو وہ معنویت عطا کرتا ہے، جو سماجی و تہذیبی استحکام میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اگرچہ تہذیبی و ثقافتی تسلسل کا یہ عمل تنقید حیات اور تحدید روایات کی صورت ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے۔ مگر تہذیبی تخلیق کا یہ عمل اس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب سماجی بحران میں نئی اقدار، فکر و افکار اور تہذیبی استحکام زوال پذیر ہو جائیں۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری اسی تہذیبی تخلیق اور سماجی اقدار کی محافظ نظر آتی ہے۔ عظیم انسان صدیقی اشفاق احمد کی تہذیبی اقدار کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

" اشفاق احمد کا افسانہ گڈریا بھی ان ہی تہذیبی تقاضوں اور شدت احساس کا نتیجہ ہے اور ایسے حالات کی کوکھ سے جنم لیتا ہے جنہیں اگرچہ وسائل آمدنی کی تبدیلی اور ہجرت افراد کی وہ حقیقی بنیادیں حاصل تھیں ،جو انسانوں کے مابین درد کا رشتہ استوار کرتی ہیں۔ لیکن مفاد پرست عناصر اور طاعونی طاقتیں ان اسباب و محرکات کو ایسے آسیب میں تبدیل کر دیتی ہیں کہ کچھ عرصہ کے لیے نیک وبد کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔"(6)

اشفاق احمد گڈریا میں ان فاسد طاقتوں کے غلبہ کو بیان کرتے ہیں۔جو عوام کا رشتہ روایات سے منقطع کر دیتے ہیں۔ یہ تہذیبی روایات صدیوں کی ریاضت کے بعد معاشرے سے تنگ نظری، تعصب اور منفی طرزِ فکر کا خاتمہ کرتی ہیں ،یہ روایات معاشرے میں امن کے دیپ جلاتی ہیں۔ جس کے باعث چنتو گڈریا چنک منشی رام بن جاتا ہے، لیکن روایات کا زوال داؤجی جنت رام کو پھر سے گڈریا بنا دیتا ہے جو بظاہر کوئی تاریخی اہمیت کا حامل واقع نہیں ، مگر سماجی زندگی اور انسانی اخلاق کے پسِ منظر میں ایک اہم حادثہ ہے۔یہ واقعہ اخلاص اور وضع داری کے رشتہ قفا کو قطع کرتا ہے۔ جس کا سلسلہ انیسویں صدی کے پر آشوب بحران کے باوجود کسی نہ کسی طرح قائم رہا تھا۔

منشی چنت رام کے روحانی پیشوا، استاد محترم حضرت مولانا اسماعیل اس دور کے نمائندہ ہیں جو آمرانہ مسامراجی اور جاگیر دراز نظام کے موجودگی میں بھی محبت کے دیپ جلائے ہوئے تھے۔

ان کے علم کے خزانے بلا تفریق مذہب ،ملک و ملت، ذات وپیشہ ،رنگ و نسل اور نام و مرتبہ ہر ایک پر لوٹائے جاتے تھے۔ اسی انسان، دوستی اور بے لوث خدمت کے باعث بہت سے پارس تخلیق ہوئے۔جب چنتو گڈریا اس علم کی شمع تک رسائی حاصل کرتا ہے تو دیوانہ وار علم کا پروانہ بن جاتا ہے۔ داؤجی (چنتو) اپنے آقا اور مسیحا سے ملاقات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی؟میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا۔ چوپال زادے ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ بھئی ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔ پھر حضور نے میری عرض سے بغیر پوچھا۔کیا نام ہے تمہارا؟میں نے گنوروں کی طرح کہا چنتو۔حضرت مسکرائے پھر خود ہی بولے، چنت رام ہو گا میں نے سر ہلا دیا ۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتا تھا۔ پائجامہ کے بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں دھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپٹا ہوا تھا۔''(7)

حضرت مولانا نے نہایت محبت و شفقت سے چنت رام کو پڑھایا۔ اسی خلوص اور صداقت علم کے نتیجہ کے طور پر اختلافِ مذہب اور متضاد عقائد کے باوجود استاد شاگرد کے درمیان باہمی محبت و احترام کا رشتہ استوار ہو گیا۔

”جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنادے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام ہے۔ یہ منشی جی ہیں وہ مسیحانہ ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟۔۔۔ دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کے قدیم عظیم الشان حویلی اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ درِفیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی۔“(8)

جنت رام نے اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے علم سے معاشرے کی تاریکی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی، مگر تہذیبی زوال اور انتشار کی بدولت وہ سنہری روایات قائم نہ رہ سکیں۔ سماجی و سیاسی اقدار کے ساتھ ساتھ آدابِ تدریس اور آئین درس بھی یکسر بدل گئے۔ گولو اس تہذیبی زوال کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے:

”میرا امتحان قریب آرہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے میرے فارغ ہونے پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی ان کے یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انھیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔“(9)

اس تہذیبی زوال اور نیز آشوب زمانے نے روایات کے اس سلسلے کو بھی منقطع کر دیا تو صدیوں کی ریاضت و محنت کا ثمر تھا۔ مذہبی منافرت، سیاسی چال بازیوں اور تعصب کی آگ نے انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا۔ اس تکلیف دہ ماحول میں گولو اپنے استاد کی کوئی خدمت کرنے کے قابل نہ رہا اور اوباش رانو نے داؤجی کی جان بچا کر ان کے سر پر تھپڑ مارا اور لاٹھی تھما دی اور داؤجی بکریوں کے پیچھے ایسے چل رہے تھے، گویا لمبے بالوں والا خرید ا چل رہا ہو۔ یوں تہذیب وروایات سے عاری نسل کے نمائندہ افراد رانو اور اس کے بدمعاش دوست منشی چنت رام کو پھر سے چنتو گڈریا بنا دیتے ہیں۔

اشفاق احمد کا افسانہ ”سنگِ میل“ بھی اعلیٰ تہذیبی اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ اشفاق احمد بلا تخصیص ملک و ملت، مذہب وعقیدہ، انسانی ہمدردی، خلوص اور محبت کے جذبات کو بیان کرتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی کا کوئی مخصوص عقیدہ اور مذہب نہیں ہوتا اور انسانیت کسی خاص قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار مذہبی منافرت اور بھید بھاؤ سے بالاتر ہے اور وہ اپنی زندگی میں دو افراد سے ڈرتا ہے۔

”ابا جان کے بعد اگر مجھے کسی سے خوف آتا ہے تو وہ پتا جی تھے۔“(10)

پتا جی نے اسے وہی شفقت اور محبت دی ہے، جو ابا جان نے دی تھی۔امر نے ہندو مسلم محبت، ایثار، دلی یگانگت اور دوستی وطابقت کے دور کو نہیں دیکھا۔اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے اپنی نفرت کا اظہار یوں کرتا ہے۔

> ”شام کو ہم سیر کرنے ولگن میں گئے تو امر نے بتایا کہ اب یہ علاقہ مسلموں سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔مُسلے بہت بُرے ہوتے ہیں اس نے ہوا میں کھولنا گھما کر لیا سب کو مارتے ہیں۔“(۱۱)

ممی نے اسے جھڑتے ہوئے کہا:

> ”یہ سے بڑا آوارہ ہو گیا ہے اسے ابا جان کے پاس لے جاؤ۔“اَمر نے گھبرا کر پوچھا ابا جان کون؟““میں ایک ۔۔۔پمی بنی ہم سب ان سے پٹ چکے ہیں۔ ایک دفعہ ان کی مار کھالو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ایسی بکواس نہیں کرو گے ۔“ امر سہم گیا، کیا وہ بھی مُسلے ہیں۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔“(۱۲)

اشفاق احمد پمی کے ہاتھوں حسنہ کو آزادی ورہائی دلا کر اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ سرحد کے دونوں طرف انسانیت سے بھرپور درد مند دِل بھی موجود ہیں جو نفرت میں بھی محبت کے بیج بونا جانتے ہیں۔ اشفاق احمد تعصب اور نفرت سے پاک مذہبی عقائد سے بالا تر ہو کر انسانی بنیادوں پر قائم تہذیبی و اخلاقی اقدار اور روایات کی پرداخت چاہتے ہیں تا کہ محبت ،انسانیت اور چاہت کے پھول سرحدوں تک محدود نہ ہوں۔

اشفاق احمد کا افسانہ ”اُجلے پھول“ انتہائی لطیف انداز میں فطرت کے گہرے رنگوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اگر انسان خود پر اعتماد کرنا سیکھ لے تو بُرے حالات کو بدلنا آسان ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات ہم سے تقاضا کرتی ہیں کہ روایات کا پاس رکھتے ہوئے برے چلن کو بدلا جائے۔ ایسی سوچ کو پروان چڑھایا جائے جو مثبت انداز فکر کو فروغ دے اور بہتری کی صورتیں پیدا کرنے۔۔دکھ ،مایوسی، منفی سوچ،خوف اور درد سے دامن چھڑا کر دلیری،خوشی، امید اور حسرت کی طرف قدم بڑھائے جائیں-آلا جی اہل قلم کے آخری اجلاس میں یوں مخاطب ہوتی ہیں

> ” اس دنیا میں پہلے کیا کم دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں اور درد انگیز قصے لکھ کر ان میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہو۔ ایسی باتیں کرنے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، جی چھوٹ جاتے ہیں اور عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔“(۱۳)

اشفاق احمد روایات کی پاسداری کرنا چاہتے ہیں وہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانا اپنا اولین اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ وہ یہ اخلاقی بیداری نا صرف قارئین بلکہ ادیبوں میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ ہماری اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اقدار کا برملا اظہار کرتے ہیں اور مشرقی تہذیب کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

”اگلی صبح آلا جی نے مجھے اور آپی کو بلا کر صرف اسی قدر کہا۔”تم مشرق کی بیٹیاں ہو،یورپ کی گلیمر گریز نہیں اور مشرقی بیٹیاں بڑوں سے پوچھے بغیر کہیں نہیں جاتیں۔“(۱۴)

اشفاق احمد دورِ جدید میں فیشن، آزادی اور جدیدیت کے نام پر ہونے والے معاشرتی و اخلاقی زوال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے ہماری مشرقی روایات کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے اور روایات غیر محسوس انداز سے میں ہماری ثقافت کو نگل رہی ہیں۔نوجوان نسل اپنی سماجی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کے دائرے سے نکل کر مغربی عادات و اطوار، رہن سہن اور رسومات کو اپنانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔بے راہ روی، لغویات، بے حیائی اور بدکرداری کو جدیدیت کا نام دے۔نوجوان نسل اپنی تہذیبی اقدار کو فراموش کر رہی ہے۔مشرقی اقدار اپنی روحانی پاکیزگی، اخلاقی قدروں اور نیکی وراست بازی کی بنیاد پر مغربی تہذیب سے بلند تر ہے۔ اس لیے نوجوان نسل کو چاہیئے کہ اپنی اقدار کو اپنانے میں فخر و انبساط محسوس کریں اور مغربی تہذیب کی بے جا پیروی سے گریز کریں۔

افسانہ ” ایل ویرا“میں اشفاق احمد وراثت میں ملنے والی شرافت،ماں باپ کی اقدار،تربیت اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ بچپن سے ملنے والی یہ تہذیبی روایات انسان کی گھٹی میں شامل ہو جاتی ہیں اور ان سے پیچھا چھڑانا ممکن ہو جاتا ہے۔انسان کی ابتدائی تربیت اور تعلیم اخلاق سازی اور کردار سازی کی بنیاد ہیں۔اشفاق احمد دو دوست لڑکیوں کا احوال کچھ یوں بیان کرہیں :

”ٹھاکر جی اور بھلی لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میرے کھاتے میں انہوں نے وہ بدتمیز اور بددماغ لڑکی ڈال دی۔ میں موٹر چلا رہا تھا اور پسینے کے باعث سٹیرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔میرے باپ دادا کی بڑی بڑی سفید پگڑیاں میرے پیر چاچا چھ کی دستار مبارک میرے مزارعوں کی اُٹھتی انگلیاں اور ہمارے ملازموں کی دبی ہنسی ایک ساتھ موٹر کے پہلو میں اڑی ہوئی تھی۔“(15)

اس افسانے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی ہوس، تکبر، غرور اور اندھے پن میں اُن پر خلوص محبتوں سے بھی محروم ہوتے ہیں، جن کی بنیاد سچائی اور اخلاص پر ہوتی ہے۔ماریہ کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کی وجہ سے مصنف ایل ویرا کی بے لوث محبت اور چاہت کو سمجھ نہیں پاتا،وہ ایل ویرا کی محبت کو محض حماقت خیال کرتا ہے

”ٹکٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مڑے تڑے ہزار لیرے کے دو نوٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ مجھے ایل ویرا کی حماقت پر ہنسی آگئی۔ (16)

ایل ویرا جو مصنف کی نظر میں صرف ایک طوائف تھی ، اپنی قیمت واپس کر دیتی ہے۔لیکن مصنف اُس کے احساسات و جذبات کی قدر نہیں کرتا اور خود نیپلز کے ساحل پر ماریہ کا انتظار کرتا ہے ماریہ وہاں نہیں آتی۔

"رات کو نو بج چکے تھے اور ماریہ اور آنا کا پتہ نہ چلتا تھا۔میں گینگ والے
کے پاس کھڑا پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔"(17)

ایل ویرا محبت کے ہاتھوں مجبور ساحل پر مصنف کو خدا حافظ کہنے پہنچ جاتی ہے جس کے ذریعے اشفاق احمد قارئین کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ مقام و مرتبہ سونے چاندی اور شان و شوکت کی ہوس انسان کو خالص اور سچی محبتوں سے بے گاز کر دیتی ہے اور انسان بے حسی کی چادر اوڑھے احساسات کو دفن کر دیتا ہے مگر سچی محبت کبھی نہیں مرتی ، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

اشفاق احمد کا ایک اور افسانہ "ایک ہی بولی "میری اخلاقیات کا وہ بنیادی خلیفہ بیان کرتا ہے جو انسانی تھا اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔اشفاق احمد اس ناول میں جانوروں مثلاً ولایتی گھوڑی اور دیسی بچھیری کی کے ذریعے مغرب اور مشرق کے افراد کی ذہنیت کا فرق واضح کرتے ہیں۔زبان یا بولی تہذیبی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے جو معاشروں کے باہمی میل جول میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔زبان ابلاغی رابطے کے لیے ضروری ہے تاکہ آپس میں مشترکہ ادراک اور شعور پیدا ہو۔ایک دوسرے کے خیالات و خدمات کے باہمی تبادلے سے ہی مشترکہ تہذیب و ثقافت پروان چڑھتی ہے۔زبان اور ایک جیسی بولی قوموں اور تہذیبوں کی اہم میراث اور قیمتی اثاثہ ہے۔

بولی یا زبان کا فرق بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جب تک ایک دوسرے کی بات اور خیالات کی سمجھ نہیں آئے گی، تب تک باہمی میل جول اور تعلقات نہیں بڑھ سکتے۔جہاں آپس کی بات سمجھ میں نہ آئے وہاں میل بڑھانا ممکن نہیں۔افسانے کے کردار گاموں میراثی اور کرملی اس نقطہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"اپنی بچھیری اس کا کلام نہیں اپاتی، گل نئیں سمجھتی۔جو کدی اس کی بولی کو
اپڑ جائے سیس نوا کر گوڈے ٹیک دے پر دونوں میں فرق بہت
ہے۔"(18)

کرملی دونوں کی آواز کو ایک جیسا قرار دیتا ہے پر گاموں اس کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے:

"کرملی بولیا" چاچا میرے حساب سے تو دونوں کی ایک جیسی آواز ہے، اِک
جیسی بولی ہے، اِک ہی چنگھاڑ ہے۔"

"ناں بھائی ناں۔ناں میرا سوہنا " گاموں سر موڑ کر بولیا۔" اپر اپرتے
بولی ایک جیسی ہے، پر بڑا فرق اے، بڑی ورل اے، دوناں کلیاناں اے
اندر، بچھیری ہور بولدی اے، گھوڑا ہور بولدا اے۔بڑا فرق ایہہ میل
نہیں ہو سکتا۔مشکل اے۔"(19)

اشفاق احمد اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ چاہے انسان ہوں یا جانور میل کے لیے دل ملنا ضروری ہے اور ملاپ میں دونوں فریقین کی رضا مندی شامل ہونی چاہیئے۔اس افسانے کا ایک دوسرا پہلو نسلوں پر ماں کے اثرات ہیں۔ جب شاہ جی کی گھوڑی اعلیٰ نسل کے گھوڑ کو رد کر کے ٹٹو کے ساتھ لگتی ہے تو وہ اس کی وجہ اس کی ماں کی عادات قرار دیتے ہیں۔

> ”سرنوا کی مٹھی آواز میں بولے۔اس کی ماں بھی بڑی کتی گھوڑی تھی۔اچھی نسل ہونے کے باوجود وہ بی ربال پسند کرتی تھی کنجری ۔“(20)

اشفاق احمد کا افسانہ کہکشاں ”ٹیکسی سٹینڈ“ معاشرتی اخلاقیات،روایات ، رسم و رواج اور رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔یہ تمام تہذیبی عناصر مل کر انسان کی زندگی کی خاص سمت کا تعین کرتی ہیں اور انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔انسانیت کا احترام اور رشتوں انسانی کی پاسداری ہماری تہذیب اور ثقافت کا لازمی حصہ ہے اور یہ ہماری شخصیت سازی میں شامل ہے۔

اشفاق احمد لکھتے ہیں :

> ”مجھے چونکہ رفاہِ عامہ کے کاموں سے گہری دلچسپی ہے اور میں پردیسیوں کی مدد کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔“(21)

اسی طرح ایک اور افسانہ بولتا”بندر“اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معاشرے میں برائی کو آغاز میں ہی روکنا ضروری ہے کیونکہ اگر اسے شروع میں نہ روکا جائے تو وہی برائی معاشرے کا ناسور بن جاتی ہے اور اس کو ختم کرنا اور سدباب کرنا نہایت مشکل ثابت ہوتا ہے۔اشفاق احمد رشوت کی برائی کو یوں بے نقاب کرتے ہیں:

> ”لیڈی مارک نے کہا۔تم اوپر نیچے، دائیں بائیں ہوا میں گولیاں چلاتے رہا کرو اور اونچے اونچے للکارتے رہا کرو۔تمہارا ایمونیشن ختم ہوتا رہے گا،پھر میں کیپٹن کو بھی بنگلے پر بلوا کر صاحب سے حکم کروا دوں گی،وہ تم کو نہیں پوچھے گا۔ یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے ہر سپاہی کو چاندی کے دو، دو روپے نذرانے کے طور پر دیئے اوریوں ری کے علاقے میں پہلی مرتبہ رشوت کی بنیاد پڑی۔“(22)

یہ اقتباس نہ صرف رشوت جیسی قبیح برائی کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اس میں سفارش جیسی برائی کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ان دونوں معاشری و سماجی برائیوں کے اثرات آج تک جاری ہیں،اگرچہ لیڈی مارک نہایت تدبر سے کام لیتے ہوئے گیدڑوں کی نسل بندی کر کے ان کا خاتمہ کرتی ہیں،لیکن ری میں سفارش اور ثبوت جیسی اخلاقی برائیوں کو پنپنے کے لیے بنیاد مل گئی۔

اشفاق احمد اصلاح معاشرہ کے لیے بدی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ برائی، بدی اور گناہ سے بچنے کی تلقین کے مختلف طریقے بتاتے ہیں۔ ان کا افسانہ "بڑھی بلی" بدی کے برے نتائج اور آئندہ نسلوں پر اس کے اثرات بیان کرتے ہوئے بائبل کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

"اِن ایام میں پھر یوں نہ کہیں گے کہ باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت کھٹے ہو گئے، کیونکہ ہر ایک اپنی ہی بد کرداری کے سبب مرے گا۔ ہر ایک جو کچے انگور کھاتا ہے اسی کے دانت کھٹے ہوں گے۔"(23)

اشفاق احمد کی افسانہ نگاری تہذیبی، تخلیقی اور سماجی اقدار کی محافظ و نگہبان نظر آتی ہے۔ وہ ان تہذیبی روایات کے ذریعے معاشرے سے تنگ نظری، صنفی طرزِ فکر اور تعصب کا خاتمہ چاہیے۔ ان کے افسانے ملک و ملت، مذہب و عقیدہ، خلوص و محبت اور انسانی ہمدردی کے جذبات کا مظہر ہیں۔

حوالہ جات

1. فیض احمد فیض، پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی، مشمولہ: مجلہ سر سید ین پاکستانی ادب، مرتبہ: رشید امجد فاروق علی، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سر سید کالج، ۱۹۸۱ء
2. عابد حسین سید، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو (ہند)، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۰۸
3. Enclopedia Britannica (vol-ii) William Benton puplisher Hellen Hemming way Benton Chicago USA 1973-74
4. Ibid
5. حسین، سید مجاور، اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، اترپردیش: اُردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴
6. صدیقی، عظیم الشان، اُردو افسانہ فکری وصی و مباحث۔ لاہور: بک ٹاک میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶۴
7. احمد اشفاق، گڈریا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷
8. ایضاً، ص ۲۸-۲۷
9. ایضاً، ص ۳۵

10. اشفاق احمد سنگِ میل مشمولہ ایک محبت سو افسانے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء

11. ایضاً،ص ۵۸

12. ایضاً،ص ۵۸

13. اشفاق احمد گڈریا،ص ۱۲۲

14. ایضاً، ص،۱۱۵

15. اشفاق احمد ایل ویرا، مشمولہ گڈریا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء ص،۱۴۲

16. ایضاً،ص،۱۵۹

17. ایضاًص،۱۵۹

18. اشفاق احمد ایک ہی بولی مشمولہ پھلکاری،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء ص ۲۰

19. ایضاً،ص،۲۰

20. ایضاًص،۲۲

21. اشفاق احمد،کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ مشمولہ طلسم ہوش افزاء،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۶۹

22. اشفاق احمد بولتا بندر مشمولہ طلسم ہوش افزاء،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء ص،۱۱۴

23. اشفاق احمد،بدی بلی،مشمول ادبیات سہ ماہی جلد ۷ شمارہ ۰ ۳ ۱ اسلام آباد:اکادمی ادبیات ،۱۹۹۴ء ص،۱۲